عباد اللہ فاروقی مرحوم (قسط نمبر ۲)

اقبالؒ کے قرآنی تصورات

فلسفۂ اخلاق

اقبال کا فلسفہ دراصل اسلامی فلسفۂ اخلاق کے بنیادی اصول تخلقو با خلاق اللہ کی تفسیر ہے۔ چونکہ انسان کا اصل ایزدی ہے۔ اس لئے انہی ایزدی عناصر کی نشوونما و تربیت انسانی زندگی کا سب سے بڑا اخلاقی و مذہبی فریضہ ہے۔ خدا چونکہ رحمٰن، رحیم، قہار، ہادی اور رب ہے اس لئے اس قسم کی صفات پیدا کرنا انسانی زندگی کا بھی منتہائے کمال ہے

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن — گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
بنتے ہیں مری کارگہِ فکر میں انجم — لے اپنے مقدر کے ستارے کو تو پہچان

نفسِ انسانی میں یہ ایزدی صلاحیتیں امکانی طور پر موجود ہیں۔ ان صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لئے قرآن سرچشمۂ ہدایت و رحمت ہے۔

یایھا الناس قد جاءتکم موعظۃ من ربکم وشفاء لما فی الصدور وھدی و رحمۃ للمومنین (۱۰/۵۷)

"اے لوگو تمہارے پاس پروردگار کی طرف سے ایک ایسی چیز آگئی جو موعظت ہے۔ دل کی تمام بیماریوں کے لئے شفا ہے اور ہدایت و رحمت ہے اُن لوگوں کے لئے جو اس پر ایمان رکھتے ہیں۔" دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر (۵۴/۱۷)

اور حقیقت یہ ہے کہ نصیحت حاصل کرنے کے لئے ہم نے قرآن کو بہت ہی آسان کر دیا ہے تو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے۔

علامہ فرماتے ہیں قرآنی تعلیم کے زیر اثر اسلامی خودی پروان چڑھتی ہے۔ اسلام کی خودی کی اقبال اس طرح تشریح کرتے ہیں۔

رُوحِ اسلام کی ہے نورِ خودی نارِ خودی — زندگانی کے لئے نار خودی نور و حضور
یہی ہر چیز کی تقویم یہی اصل سفر — گرچہ اس رُوح کو فطرت نے رکھا ہے مستور
لفظ اسلام سے یورپ کو اگر کد ہے تو خیر — دوسرا نام اس دین کا ہے فقرِ غیور!

اس خودی کا وجود صرف افراد ہی میں نہیں بلکہ اقوام میں بھی پایا جاتا ہے اور ہر قوم ایک مخصوص خودی کی حامل ہوتی ہے۔ قومی خودی کو سب سے زیادہ نقصان دینے والی چیز غلامی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے لا تجعلوا للہ اندادا (۲/۲۲) "کسی غیر خدا طاقت کی غلامی نہ کرو"۔ غلامی کے باعث قوم کے تمام اعلیٰ نفسی صائص فنا ہو جاتے ہیں۔ وہ انسانوں کی طرح نہیں بلکہ حیوانوں کی طرح زندگانی گزارنا شروع کر دیتے ہیں۔

غلامی کی نفسیات کو اقبال اس طرح بیان کرتے ہیں۔

سخت باریک ہیں امراض اُمم کے اسباب — کھول کر کہیئے تو کرتا ہے بیان کوتاہی
دین شیری میں غلاموں کے امام اور شیوخ — دیکھتے ہیں فقط ایک فلسفۂ روباہی
ہو اگر قوتِ فرعون کی درپردہ مرید — قوم کے حق میں ہے لعنت وہ کلیم اللہی

از غلامی دل بمیرد در بدن — از غلامی رُوح گردد بار تن
از غلامی مردِ حق زنار بند — از غلامی گوہرش نا ارجمند

علامہ فرماتے ہیں توحید صرف خدا کی عبادت سے قائم نہیں ہوتی بلکہ اس کے لئے غیر اللہ کی غلامی کے بندھنوں سے آزادی ضروری ہے۔

لا و الا احتسابِ کائنات — لا و الا فتح بابِ کائنات
ہر دو تقدیرِ جہاں کاف و نون — حرکت از لا زاید از الا سکون
تا نہ رمزِ لا الہ آید بدست — بندِ غیر اللہ را نتواں شکست[1]

---

[1] مثنوی پس چہ باید کرد ص ۱۹

قرآنی نظام کی رُو سے ایک انسان دوسرے انسان کا غلام نہیں ہو سکتا۔ فرعون اس لئے واجب التعزیر تھا کہ انسانوں کے گلے میں اپنی غلامی کا طوق ڈالنا چاہتا تھا۔ اس نے اہالیانِ مصر سے کہا تھا۔

(انا ربکم الاعلیٰ (۷۹/۲۴)

میں تمہارا سب سے اعلیٰ رب ہوں۔

(ما علمت لکم من الٰہ غیری (۲۸/۳۸)

میں نہیں جانتا کہ میرے سوا کوئی اور بھی اللہ ہے۔

قرآن ایسے خداؤں کی نفی کرتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ قل ان الامر کلہ للہ (۳/۱۵۲) یعنی جملہ اختیارات حکومت اللہ کے لئے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے غیر طاقتوں کی عبودیت سے انکار کرنے کے جب اثباتِ حق کا اعلان کیا تو فرمایا

(انی وجھت وجھی للذی فطرت السمٰوٰت والارض حنیفا وما انا من المشرکین (۶/۸۰)

"میں نے تو ایک کا ہی ہو کر اپنا رخ اسی ذات پاک کی طرف پھیر لیا ہے جس نے آسمان و زمین کو بنایا اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔"

ان قرآنی حقائق کو اقبال یوں بیان فرماتے ہیں ؎

صنم کدہ ہے جہاں اور مردِ حق ہے خلیل
یہ نکتہ وہ ہے کہ پوشیدہ لا الٰہ میں ہے[1]

دوسری جگہ فرماتے ہیں ؎

مسلمانیم و آزاد از مکانیم — بروں از حلقہ نہ آسمانیم
بما آموختند آں سجدہ کردے — بہائے ہر خداوندے بدانیم

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

معبودِ حقیقی کا یہ قرآنی تصور پیش کرنے کے بعد اقبال عبد اور عبادت کا تصور پیش کرتے ہیں۔

---

[1] بالِ جبریل صفحہ ۹۹

قرآن کی رُو سے "عبادت" اور "محبت" میں امتیاز کرنا بہت مشکل ہے۔ بلکہ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت محبت ہی عبادت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا ہے۔ "آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو میری اتباع کرو"۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کے بغیر اللہ تعالیٰ کی محبت غیر ممکن ہے۔ ظاہر ہے کہ اتباع اور پیروی سے مراد عبادت ہے کیونکہ تتبع اعمال ہی میں ہوتا ہے لیکن عبادت کی روح محبت ہے اسی لئے تعبدون کی جگہ محبون فرمایا۔ یہاں یہ بھی واضح رہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع ہی سے عبادت الٰہی ہو سکتی ہے۔ جہاں مسلمان حضورؐ کے نقشِ قدم سے ہٹا، صراطِ مستقیم سے بھٹکا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جستجوئے معبود کے سلسلہ میں یہ بات کتنی سبق آموز ہے کہ جب آپ نے ستارہ کو دیکھا تو فرمایا لا احب الآفلین اور لا اعبد الافلین نہیں فرمایا۔ حالانکہ جستجو معبود کی تھی کہ جس کی عبادت کی جائے اور جس پر ایمان لایا جائے۔ یہاں بجائے اَعبُد کے اُحِبُّ کے استعمال فرمانے سے خالقِ حقیقی کا منشاء یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایمان و عبادت سے دراصل محبت مقصود ہے۔ کیونکہ نورانی کیفیت بغیر محبت کے پیدا نہیں ہو سکتی۔

یہی وجہ ہے کہ بعض صوفیائے کرام نے آیہ کریمہ وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون میں لیعبدون کا مفہوم لیعشقون یا لیعرفون لیا ہے۔

جب ہم حق تعالیٰ کے کمالات و احسانات پر غور کرتے ہیں اور اس کا یقین ہمارے قلب کی گہرائیوں میں سما جاتا ہے تو حق تعالیٰ سے لازمی طور پر محبت پیدا ہوتی ہے اور یہی مراد ہے حق تعالیٰ کے اس قول سے کہ والذین اٰمنوا اشد حبا للہ (جو لوگ ایمان رکھتے ہیں ان کو اپنے اللہ سے شدت سے محبت ہوتی ہے۔)

علامہ فرماتے ہیں ؎

عاشقی توحید را بر دِل زدن — واں گہے خود را بہر مشکل زدن

کاروانِ شوق بے ذوقِ رحیل — بے یقین و بے سبیل و بے دلیل

یہ عشق سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی بات پر یقین لانے ان کی اتباع اور تقلید کا نتیجہ ہے ؎

مے ندانی عشق و مستی از کجاست ؟
ایں شعاعِ آفتابِ مصطفٰےؐ است

زندۂ تا سوز او در جانِ تست !
ایں نگہ دارندۂ ایمانِ تست !

مندرجہ ذیل آیت کریمہ کا اقبال یوں ترجمہ کرتے ہیں۔

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ (پ ۳- ع ۱۲)

؎ عاشقی ؟ محکم شو از تقلیدِ یار
تا کمندِ تو شود یزداں شکار

حضرت بایزید بسطامیؒ نے خربوزہ کھانے سے محض اس بنا پر اجتناب کیا کہ انہیں معلوم نہ تھا کہ نبی کریمؐ نے یہ پھل کس طرح کھایا ہے۔ اسی کامل تقلید کا نام اقبال کہتے ہیں عشق ہے۔

کیفیت ہا خیزد از صہبائے عشق — ہست ہم تقلید از اسمائے عشق
کاملِ بسطام در تقلید فرد — اجتناب از خوردنِ خربوزہ کرد
لشکرے پیدا کن از سلطانِ عشق — جلوہ گر شو بر سر فارانِ عشق
تا خدائے کعبہ بنوازد ترا — شرح اِنّی جَاعِلٌ سازد ترا (اسرار خودی)

اتباع خود بغیر حُبِّ رسول ممکن نہیں۔ اتباع و تقلید کا محرک عشق ہی ہوتا ہے۔ اتباعِ رسول دراصل اتباعِ حق ہے۔ اتباعِ حق و اتباعِ رسول کا نام اتباعِ شریعت ہے۔ چنانچہ علامہ فرماتے ہیں کہ دین کامل بغیر شدتِ حُب یا عشق کے ممکن نہیں ؎

طبع مسلم از محبت قاہر است — مسلم از عاشق نباشد کافر است
طابع حق دیدنش نادیدنش — خوردنش نوشیدنش خوابیدنش

مختصر یہ کہ عشق اقبال کے نزدیک توحید و تقلید یار کے سوا کچھ نہیں۔ اس لئے وہ دین و ایمان کو عشق کے مرادف قرار دیتے ہیں۔

زندگی را شرع و آئین است عشق — اصل تہذیب است دین است عشق
دیں نگردد پختہ بے آداب عشق — دیں بگیر از صحبت ارباب عشق
ظاہرِ اُو سوز ناک و آتشیں — باطنِ اُو نور رب العالمیں

عشق سے محویت (محویت فی الذات) پیدا ہوتی ہے۔ محویت ہی کے عالم میں ارادے اور علم میں اطلاقیت

پیدا ہوتی ہے۔ کشف کو فی کشف الٰہی اور تصرفات کا ظہور ہوتا ہے جو عبد کا اختیاری فعل نہیں۔

علامہ فرماتے ہیں ؎

اہل حق را رمز توحید از بر است — در اٰتی الرحمٰن عبداً[۱] مضمر است

چوں مقام عبدہٗ محکم شود — کاسۂ دریوزہ جام جم شود[۲]

جاوید نامہ میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان میں منصور حلاج کی زبانی عبد و عبدہٗ کا فرق بیان کیا ہے۔ فلک مشتری پر زندہ رود حلاج سے حقیقت محمدی کا راز معلوم کرنا چاہتا ہے۔ کیا وہ حقیقت میں آدم ہے یا جوہر ہے جو کبھی کبھی وجود میں آتا ہے ؎

از تو پرسم گرچہ پرسیدن خطاست — سرِّ آں جوہر کہ نامش مصطفیٰؐ است

آدمے یا جوہرے اندر وجود — آنکہ آید گاہے گاہے در وجود

اس کے جواب میں حلاج عبد اور عبدہٗ کا فرق بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ کائنات میں نورِ مصطفیٰ[۳] صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی بہار ہے۔ وہ جوہر دہر ہے اور دہر اسی سے پیدا ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ صورت گر تقدیر ہے۔

پیش اُو گیتی جبیں فرسودہ است — خویش را خود عبدہٗ فرمودہ است

عبدہٗ از فہم تو بالاتر است — زانکہ او ہم آدم و ہم جوہر است

جوہر اُو نے عرب نے اعجم است — آدم است و ہم ز آدم اقدم است

عبدہٗ صورت گر تقدیر ہا — اندرو ویرانہ ہا تعمیر ہا!

---

۱ ان کل من فی السموات والارض الا اٰتی الرحمٰن عبداً (۱۹/۹۳)

جتنے بھی کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہیں سب خدا تعالیٰ کے رُوبرو عبد ہیں۔

۲ رموز ص ۱۰۵

۳ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ارشاد فرماتے ہیں "حق سبحانہٗ تعالیٰ اُو را نور و سراج منیر در غایت انارت خواند کہ روشن و پیدا گشت بجمال و کمال دے صلی اللہ علیہ وسلم البصائر و بصائر" حق سبحانہٗ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو غایت درجہ کی نورانیتؐ تابانی کی وجہ سے سراج منیر فرمایا کیونکہ حضورؐ کے جمال و کمال سے بصارتیں اور بصیرتیں روشن اور منور ہوئیں۔

(مدارج النبوۃ جلد اوّل ص ۱۰۶)

عبدہٗ ہم جانفزا ہم جانستان | عبدہٗ ہم شیشہ ہم سنگِ گراں
عبد دیگر عبدہٗ چیزے دیگر | ما سراپا انتظار اُو منتظر
عبدہٗ دہر است و دہر از عبدہٗ | ما ہمہ رنگیم اُو بے رنگ و بوست
عبدہٗ با ابتدا بے انتہاست | عبدہٗ را صبح و شام ما کجاست
کس ز سرِ عبدہٗ آگاہ نیست | عبدہٗ جز سرِ الا اللہ نیست
لا الٰہ تیغ و دم اُو عبدہٗ | فاش تر خواہی بگو ہو عبدہٗ
عبدہٗ چند و چگون کائنات | عبدہٗ رازِ درونِ کائنات
مدعا پیدا نگردد زیں دو بیت | تا نہ بینی از مقامِ ما رمیت [1]

عبدیت قرب و وصال کا افضل ترین مقام ہے۔ معراج کے بیان میں حضور صلعم کو عبد ہی سے مخاطب کیا گیا۔

سبحٰن الذی اسریٰ بعبدہٖ (پ ۱۵، ع ۱)

فاوحیٰ الیٰ عبدہٖ ما اوحیٰ (پ ۱۷، ع ۱۵)

اقبال کے نزدیک عشق و ایمان کامل کے حصول سے عبدیت کا مقام کامل ہو جاتا ہے۔ ایمان کے لازمی نتیجہ کے طور پر بقولے الذین اٰمنوا اشد حبا للّٰہ شدتِ حُب یا عشق پیدا ہوتا ہے۔ عشق سے عمل میں قوت علم میں وسعت اور قلب میں سرور پیدا ہوتا ہے۔

سِرِّ قدر

قرآن کریم کی تعلیم میں جبر کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ مثلاً

انا کل شیئٍ خلقنٰہ بقدر۔ ہم نے ہر چیز بنائی پہلے کر۔

و کل شیئٍ فعلوہ فی الذبر۔ اور جو چیز کی ہے انہوں نے ورقوں میں۔

اللہ تعالیٰ ہر شے، ارادہ اور افعال کا خالق ہے۔ خالق کل شیئٍ۔

---

[1] جاوید نامہ صفحہ ۱۵۰

واللہ خلقکم وما تعملون ۔ اور اللہ نے پیدا کیا تمہیں اور جو تم کرتے ہو۔

پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی واضح ہے۔

لا یومن احدکم حتی یومن بالقدر خیرہ وشرہ من اللہ تعالے

یعنی کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اس امر پر ایمان نہ لائے کہ خیر و شر کی تخلیق من اللہ ہے۔

اب قرآن حکیم کی دوسری آیات ملاحظہ ہوں جن کے مطابق انسان کو اختیار دیا گیا ہے۔ وہ مجبور محض بلکہ با اختیار ہے لہٰذا سزا و جزا کا مستحق ہے۔

(۱) لا یکلف اللہ نفساً الا وسعھا لھا ما کسبت وعلیھا ما اکتسبت ۔

اللہ تکلیف نہیں دیتا کسی کو مگر جس قدر اس کی گنجائش ہے۔ جس نے جو کمایا اس کو وہی ملتا ہے اور اسی پر پڑتا ہے جو اس نے کیا۔ (البقرہ)

(۲) ان احسنتم احسنتم لانفسکم وان اساتم فلھا ۔

اگر تم نے بھلائی کی تو اپنے لئے کی اور برائی کی تو اس کا وبال بھی تم پر ہے۔

علامہ اس ظاہری تضاد کو رفع کر کے انسان کو با اختیار تسلیم کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ انسان جو زندگی کے تمام مظاہر میں سب سے زیادہ ارتقا یافتہ اور مکمل ہے زندگی کی حرکت کو اس صورت میں باقی رکھ سکتا ہے کہ وہ زندگی اور فطرت کی قوتوں کو تسخیر کرے۔ زندگی کی تسخیر کے لئے انسان کی حرکت جب اپنے آپ کو منظم کرتی ہے تو عمل کہلاتی ہے۔

اقبال کے نزدیک زندگی سے مقابلہ کی حد تک انسان اپنے اُوپر مجبوری کی تہمت نہیں لگا سکتا۔ مذہبی حد تک وہ اس عقیدہ کے قائل تھے کہ ایمان جبر و قدر کے درمیان ہے۔

؎ چنیں فرمودہ، سلطانِ بدر است

کہ ایمان درمیان جبر و قدر است

لیکن تقدیر جو وقت بھی ہے اور زندگانی کی ہر قوت کی طرح قابلِ تسخیر بھی۔ اس کی حد تک وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ

تقدیرات حق لا انتہا است

اس طرح آزادی ارادہ کے لئے جگہ نکلتی ہے اور انسان پر اپنے فعل کی پوری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

کسی شے کی تقدیر نہ ٹلنے والی مقسوم نہیں جو خارج سے جبریہ طور پر عائد کی گئی ہو۔ بلکہ وہ خود شے کی اندرونی رسائی اور اس کے قابلِ تحقق امکانات ہیں جو اس کی فطرت میں پوشیدہ ہیں۔ ان امکانات کا ظہور متواتر طور پر بلا کسی خارجی جبر کے عمل میں آتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ انسان کو قادرِ مطلق سے جو اختیار ملا ہے وہ محدود ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اختیار ہی انسانی ارتقار کا اصل محرک ہے اور اسی پر دین و تمدن کی بنیادیں قائم ہیں۔ انسانی آزادی محدود و مشروط ہے۔ اس کے اختیار کا مطلب یہ ہے کہ اس کی اندرونی زندگی میکانکی جبر سے آزاد ہے لیکن اس کی خارجی زندگی پر طبعی اثرات اس طرح مترتب ہوتے ہیں جس طرح دوسرے فطری مظاہر پر۔ اس واسطے ایمان کو جبر و اختیار کے درمیان بتایا گیا ہے۔ اقبال کہتا ہے کہ اگر تقدیر انسان کے سازگار نہیں تو وہ خدا سے دوسری تقدیر طلب کر سکتا ہے اور اگر کوئی شخص اپنی خلقت کی پوری صلاحیتوں کے ساتھ کوئی چیز طلب کر گیا تو اسے ضرور مل جائے گی۔ حرکیت کا تقاضا زمانے کی مخالفانہ قوتوں کا مقابلہ ہے۔

ع حدیثِ بے خبراں ہے تو با زمانہ بساز
زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز

فلسفۂ دہر

حرکت اور عمل کے لیے ارادے کی ضرورت ہے اور ارادہ بغیر آزادی کے مؤثر نہیں ہو سکتا۔ آزادیٔ ارادہ کا مسئلہ دراصل وقت کا مسئلہ ہے۔ اقبال کے یہاں حرکت کے مسئلے کا بہی دار و مدار بڑی حد تک زمانے کے تصور پر ہے۔ زندگی میں کوئی چیز ساکن نہیں ایک مسلسل حرکت ہی حرکت ہے۔ ایک مستقل تبدیلی مستقل تغیر کا تصور وقت کے بغیر ممکن نہیں۔

اقبال کے فلسفہ میں زمان کے دو تصور پائے جاتے ہیں۔ ایک تو زمان کا باطنی پہلو ہے جو انسان کی جان میں پوشیدہ ہے اور اس لیے اس کو صرف عارف ہی کی نظر دیکھ سکتی ہے۔ اس کا اصطلاحی نام زمانِ حقیقی یا مرورِ خالص (PURE DURATION) ہے۔ زمانہ حقیقی ان معنوں میں ہے کہ وہ خارج میں موجود ہے اور الحقیقتہ، کا ایک لازمی عنصر ہے لیکن اس کی حقیقت مجہول الکنہ ہے۔ یعنی اس کی منطقی تعریف نہیں ہو سکتی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہم اس کی حقیقت کو اپنے باطن میں محسوس کر سکتے ہیں۔ حقیقی زمان ایک نوع کی تخلیقی فعلیت (CREATIVE ACTIVITY) ہے جس میں نہ ماضی ہے نہ حال نہ مستقبل۔

زمانہ کا دوسرا پہلو خارجی ہے جس کا تصور ہر شخص کر سکتا ہے یعنی سلسلۂ روز و شب جو نقاش حوادث ہے اسے اصطلاح میں زمانِ مسلسل (CERIAL TIME) کہتے ہیں۔ زمانِ مسلسل مرورِ خالص سے پیدا ہوتا ہے اس کو سمجھنے کے لئے غوطہ زنی یا غوّاصی کی ضرورت نہیں ہے ؎

زمانہ کہ زنجیرِ ایام ہے
دموں کے الٹ پھیر کا نام ہے

زمانِ خالص میں وجودِ زمان مسلسل کی تخلیق ہوتی ہے۔

سلسلۂ روز و شب تارِ حریرِ دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات

یعنی اللہ کی تمام صفات مثلاً پیدا کرنا، پرورش کرنا، رزق دینا، مارنا، زندہ کرنا زمان و مکان ہی میں ظاہر ہوتی ہے۔ تارِ حریرِ دو رنگ یعنی کالے اور سفید رنگ کے ریشم کے تار۔ سفید سے دن مراد ہے اور کالے سے رات۔

سلسلۂ روز و شب سازِ ازل کی فغاں
جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بمِ ممکنات

یعنی زمانہ اللہ تعالیٰ کی تخلیقی فعلیت کا نام ہے اور تمام مخلوقات (ممکنات) بقیدِ زمان و مکان ہی عالمِ وجود میں آتی ہیں۔ یہ زمانِ مسلسل جو تخلیق کیا جاتا ہے انسان کی حرکت اور عمل کا سب سے بڑا امتحان بھی ہے۔

اقبال کو یہاں تک برگساں کے تصورات سے پورا اتفاق ہے۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ برگساں زندگی کی روانی اور حرکت کو بے مقصد بتاتا ہے لیکن اقبال اس کو بامقصد بتاتا ہے۔ یہ مقصد اقبال کے نزدیک پہلے ہی سے متعین ہیں بلکہ ہر دم متعین کیا جا رہا ہے ؎

ہر دم نیا شوق نئی برقِ تجلّی
اللہ کرے مرحلۂ عشق نہ ہو طے

اقبال نے اسرارِ خودی میں امام شافعیؒ کا مقولہ "الوقت سیف" نقل کیا ہے اور اپنے مخصوص انداز میں اس مقولہ کے فلسفیانہ متعلقات کی وضاحت کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وقت ایسی شمشیر ہے جس کی آب زندگی سے عبارت ہے۔ جس ہاتھ میں یہ شمشیر ہے وہ دستِ کلیم سے زیادہ روشن ہے۔ اس شمشیر کی ایک ضرب سے

پتھر میں سے چشمے ابل پڑتے ہیں اور سمندر خشک ہو جاتے ہیں۔ اسی شمشیر سے حضرت موسیٰ نے سینۂ احمر کو چاک کیا۔ اور قلزم کو مثل خاک کے خشک کر دیا۔ حضرت علی نقیؑ کے دستِ مبارک میں یہی سیف روزگار تھی۔ جس سے ان کی فتوحات عمل میں آئیں۔ جو شخص اسیرِ دوش و فردا ہے وہ ایک ایسا باطل فروش ہے جسے کبھی عرفان حیات حاصل نہیں ہو سکتا۔

اگر کوئی شخص یا جماعت زمان کو معروض اور خارجی تصور کرتی ہے جو اس پر عائد کیا گیا ہے تو ضروری ہے کہ زندگی کے متعلق اس کے نقطۂ نظر میں جبری عنصر موجود ہے۔ برخلاف اس کے زمانے کو موضوعی تصور کرنے والا شخص اپنی قوتِ ارادی سے کائنات میں تصرف کرنے اور اپنی خودی کو مستحکم و ابدی بنانے کا قائل ہوگا۔

جو شخص زمان کی اس حقیقت سے واقف نہیں وہ حیات جاوداں سے بھی آگاہ نہیں۔ زمانے کو بھی لیل و نہار کے پیمانے سے اس طرح ناپنا جیسا کہ ہم مکان کو آگے پیچھے کی سمتوں کے ذریعہ ناپتے ہیں بڑی سخت غلطی ہے اگرچہ زمان و مکان ایک دوسرے سے مل کر زمان و مکان کا چار العبادی سلسلہ بناتے ہیں لیکن پھر بھی زمان اور مکان کا بنیادی فرق باقی رہ جاتا ہے۔ محض مکان یعنی فضا میں مطلق آگے اور مطلق پیچھے کی سمتوں کا تعین کرنا ممکن نہیں ہے لیکن زمان میں ماضی اور مستقبل کا امتیاز باقی رہتا ہے۔ اس کے علاوہ زمان کے متعلق ہمارے ادراک اور مکان کے متعلق ادراک میں ایک اہم فرق ہے۔ ساری زندگی اس پر مشتمل ہے کہ ہم مستقبل میں آگے کے لئے بڑھتے ہیں۔ اس طرح ہمیں وقت کے مختلف وقفوں کے طے کرنے کا احساس ہوتا ہے۔ مکان کے متعلق ہم کو ایسا احساس صرف اس وقت ہو سکتا ہے جب کہ ہم روشنی کی رفتار سے زیادہ تیز رفتار کے ساتھ حرکت کریں جو ناممکن ہے۔ اس وجہ سے زمان کے متعلق ہمیں راست ادراک اور تجربہ ہوتا ہے لیکن مکان کے متعلق ہمارا ادراک اور تجربہ بالواسطہ ہوتا ہے۔ مکان کے متعلق ہمارا علم ہمارے حواس پر آنے والے اثرات اور ان سے اخذ کئے ہوئے نتیجوں پر مبنی ہوتا ہے۔ بالکل اس طرح خارجی دنیا کے واقعات کے درمیان جو زمانی رشتے ہوتے ہیں۔ ان کا علم بھی ہم کو بالواسطہ ہی ہوتا ہے لیکن اس کے علاوہ ہمارے شعور میں وقت اور اس کے گزرنے کا احساس ہوتا ہے۔ وہ فوری اور راست ہوتا ہے۔ اگر ہم آنکھیں بند کر لیں اور خارجی دنیا کے تمام خیالات کو دل سے نکال دیں تو اس کے باوجود ہمیں وقت کے گزرنے کا احساس ہوتا رہے گا۔ لیکن مکان کی وسعت یا تنگی کا کوئی احساس نہیں ہوگا۔ وقت کا یہی داخلی اور شعوری احساس اس کی امتیازی خاصیت ہے۔ مکان کا ہمیشہ ایک خارجی شے کے طور پر ادراک ہوتا ہے۔

بالِ جبریل میں اقبال نے "زمانہ" کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے جس میں وقت اپنی صفات کا اظہار خود اپنی زبان میں کرتا ہے۔ اس میں فاعل "انا" کے تسلسلی وقت کا بھی ذکر ہے کہ حوادث اور واقعات یکے بعد دیگرے ظہور پذیر ہوتے ہیں لیکن اصل زمان یہ تسلسلی وقت نہیں ہے بلکہ اس زمان میں خود زندگی اور تقدیر منحصر ہیں۔ جس شخص کی نظر عارفانہ نہیں وہ اصل زمان سے آگاہ نہیں ہو سکتا ؎

ہدف سے بیگانہ تیر اُس کا
نظر نہیں جس کی عارفانہ

اس نظم کی ابتدا اس تصور سے ہوتی ہے کہ ماضی کا اعادہ ممکن نہیں ہے ؎

جو تھا نہیں ہے جو ہے نہ ہوگا یہی ہے اِک حرفِ محرمانہ
قریب تر ہے نمود جس کی اسی کا مشتاق ہے زمانہ

دورانِ خالص سے زمانِ مسلسل کی تخلیق ہوتی جاتی ہے اور زمانِ مسلسل میں مرور کے تصور کے ذریعے حادثات کا شمار ممکن ہے ؎

مری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں
میں اپنی تسبیح روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ!

زمانہ اور قوتِ عمل میں اضافیت ہے۔ حرکیت زمانہ کو تسخیر کر سکتی ہے اور اگر سکون اور جمود ہو تو پھر زمانہ بجائے ایسے ہتھیار کے جس کو انسان اپنی حفاظت اور قوت کے لئے کھینچے۔ ایسا ہتھیار بن جائے گا جس کی ضرب کاری خود اُسی کو لگے ؎

ہر ایک سے آشنا ہوں لیکن جدا جدا رسم و راہ میری
کسی کا راکب کسی کا مرکب کسی کو عبرت کا تازیانہ!

زمانہ کسی کی رعایت نہیں کرتا ؎

نہ تھا اگر تو شریکِ محفل قصور میرا ہے یا کہ تیرا؟
مرا طریقہ نہیں کہ رکھ لوں کسی کی خاطر مئے شبانہ!

مستقبل اگرچہ وجود کی غائی رو کی وجہ سے بالکل اندھی آزادی نہیں رکھتا مگر پھر بھی وہ کھلے ہوئے امکانات رکھتا ہے اور کسی طرح متعین نہیں۔ اس لئے اس کے متعلق کسی قسم کی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی۔ اس کی حقیقت سے

عوام تو کیا نجومی (اور علمائے طبیعات) بھی واقف نہیں ہو سکتے۔ اس کے سمجھنے کے لئے معرفت درکار ہے یعنی مری اصلیت سے وہی شخص آگاہ ہو سکتا ہے جو اپنی خودی سے آگاہ ہو۔

آیندہ اشعار میں اقبال نے "زمانہ" کی زبان سے دُنیا کو انقلاب کا پیغام دیا ہے۔ یعنی اقبال نے اس نظم میں زمانہ کے فلسفیانہ مفہوم کو انقلابی پیغام سے بڑی خوبی کے ساتھ مربوط کر دیا ہے جس میں ان کے شاعرانہ آرٹ کا کمال نظر آتا ہے۔

جدید سائنسی رجحان جو فطرت کی طاقتوں کو اسیر کر رہا ہے ان طاقتوں کے صحیح استعمال پر قادر نہیں ہو سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جدید انسان دورانِ خالص کی ماہیت میں ڈوب کر اپنی خودی کی تکمیل نہ کر سکا۔ انسان (اقوام یورپ) نے خدا کی بجائے مادہ کو اپنا معبود بنالیا ہے۔ اگرچہ ہوائیں و دیگر اشیائے فطرت ان کے قبضے میں ہیں اس کے باوجود ان کی زندگی کے دریا میں ایک "بھنور" پڑ گیا ہے اور وہ گرداب ایسا عقدہ لاینحل ہے جس نے اُن کے سکون قلب کو زائل کر دیا ہے۔ یہ بھنور کیا ہے؟ یہ مادہ پرست مغربی اقوام کا جذبۂ مسابقت ہے ؎

ہوائیں اُن کی فضائیں اُن کی سمندر اُن کے جہاز اُن کے
گرہ بھنور کی کھلے تو کیونکر، بھنور ہے تقدیر کا بہانہ

یعنی یہ بھنور نہیں بلکہ مشیت ایزدی نے ان قوتوں کو عاد و ثمود کی طرح تباہ کرنے کا ایک سبب بنا دیا ہے۔ جدید انسان نے سرمایہ داری کو قمار خانہ بنا ڈالا اور اب زمانہ کا انقلابی پیغام ہے کہ یہ قمار خانہ منہدم ہونے کے قریب ہے اور اس کی جگہ ایک نئی دنیا اور ایک نیا تمدن ہوگا۔ جو اس شاعرانہ سرمایہ داری کا خاتمہ کر دے گا ؎

وہ فکر گستاخ جس نے عُریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اسی کی بیتاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ!

اس نظم میں فلسفہ بھی ہے اور سیاست بھی۔ اسرار حیات بھی ہیں اور پیغام انقلاب بھی۔

اقبال کے فلسفۂ زمان کی اساس حدیثِ نبوی ہے لا تسبوا الدھر والی حدیث بطور قولِ فیصل اپنے دعویٰ کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔ اقبال سے قبل شیخ اکبر (ابن عربی) کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اللہ تعالےٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک نام الدّھر (زمان) بھی قرار دیتے ہیں۔ لیکن جہاں تک اقبال کا تعلق ہے اس نے مردِ خالص کا تصور اسی حدیث قدسی سے اخذ کیا ہے۔

قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیت کے پیش نظر اقبال خارجی زمان (SERIAL TIME) کو نہ تو الوہیت کا

درجہ دیتا ہے اور نہ اس کو اس قابل قرار دیتا ہے کہ انسان کو ہلاک یا زندہ کر سکے۔

وقالوا ما ھی الا حیاتنا الدنیا ونحیا وما یھلکنا الا الدھر وما لھم بذالک من علم ان ھم الا یظنون۔ (سورہ جاثیہ ع ۳)

(ترجمہ) اور (بعث کے منکر) یوں کہتے ہیں کہ بجز ہماری اس دنیاوی حیات کے اور کوئی حیات نہیں ہے۔ ہم مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہم کو صرف زمانہ ہلاک کرتا ہے اور ان لوگوں کے پاس اس پر کوئی دلیل نہیں محض اٹکل سے ہانک رہے ہیں۔

خارجی زمان کے متعلق دوسری آیہ کریمہ میں فرمایا گیا ہے۔

لکل امۃٍ اجل اذا جاء اجلھم فلا یستاخرون ساعۃ ولا یستقدمون

یہ فرما کر بتایا گیا ہے کہ زمانہ اس قدر بے دست و پا ہے کہ وہ ایک گھڑی بھی آگے پیچھے نہیں ہو سکتا۔ سورۃ العصر نے زمانہ (SERIAL TIME) کی بے حقیقی اور بے مائیگی کو اور بھی واضح کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

والعصر ان الانسان لفی خسر الا الذین اٰمنوا وعملوا الصلحت وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر

یعنی اس دُنیا میں رحمانی اور شیطانی دو تحریکیں رائج ہیں۔ زمانہ اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ یہ تحریکیں حضرت آدم کے وقت سے آدم و ابلیس کے نام پر پہلو بہ پہلو چل رہی ہیں۔ جو لوگ خدائی تحریکوں کو قبول کر کے مامورین اور مرسلین الٰہی کی جماعتوں سے وابستہ ہو جاتے ہیں وہ کامیاب ہوتے ہیں اور فوز و فلاح حاصل کرتے ہیں۔ مگر ان کے مقابل شیطانی تحریکوں سے وابستہ ہونے والے لوگ گھاٹے میں رہتے ہیں۔ ہر زمانہ میں ایسا ہی ہوتا آیا ہے اور ہر زمانہ کے واقعات اس حقیقت الامر کی بزبانِ حال شہادت دیتے ہیں۔ شیطانی تحریکوں سے وابستہ ہونے والے لوگوں کے متعلق..... بما کانوا یکسبون، فرما کر بتایا گیا ہے کہ وہ اپنی تکالیف اپنے نظریات اور اپنے اعمال سے خود پیدا کر لیتے ہیں۔ اس میں زمانہ اور تقدیر کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔

قرآن مجید میں زمانہ (زمان خارجی SERIAL TIME) کو عدد سنین والحساب فرما کر بتایا گیا ہے کہ زمانہ وقت اور عرصہ کا یقین کرتا ہے اور واقعات و حادثات کا حساب بناتا ہے۔ زمانہ خود خالق نہیں بلکہ شمس و قمر سے پیدا شدہ دن رات کی گردش کا نتیجہ ہے۔

ھو الذی جعل الشمس ضیاء والقمر نورا وقدرہ منازل لتعلموا عدد السنین والحساب۔

یعنی سورج اور چاند کی دن رات کی گردش سے دنوں، مہینوں، سالوں کی گنتی اور وقت کا اندازہ مقرر ہے۔"

زمانہ کا دنیا کے واقعات کے اچھے یا بُرے ہونے سے کوئی سروکار نہیں۔ یہ زمانہ خدا نہیں بلکہ مخلوق ہے۔ نفع و نقصان

کا اسے کوئی اختیار نہیں بلکہ اس کی ہستی دوسرے اسباب پر منحصر ہے۔ زمانہ کے اطراف اور واقعات خدا کے مقرر کردہ ہیں اور اس کے حکم کے تحت صدور پا رہے ہیں۔

اسی خارجی زمان کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

تلك الايام نداولها بين الناس۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم زمانہ کو لوگوں اور قوموں میں پھراتے رہتے ہیں۔

یہ آیت صاف ظاہر کر رہی ہے کہ زمانہ کی گردش کا فعل کسی اور غالب ہستی کے ہاتھ میں ہے جو زمانہ کو قوموں میں پھراتی رہتی ہے نیز زمانہ کے اچھے برے اثرات بھی اس کے اختیار میں ہیں۔

عصر حاضر کے مشہور سائنس دان آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت نے دہر کی خدائی کے عقیدہ پر کاری ضرب لگائی ہے۔ جدید سائنسی تحقیق سے یہ امر ثابت ہے کہ زمان و مکان دونوں نظری اعتبار سے اور تجرباتی دلائل کی بنا پر ایک دوسرے سے الگ اور مطلق نہیں ہیں لہٰذا زمانہ کا تصور اضافی ہے اور یہ کہ زمانہ مطلق نہیں ہے۔

حدیث قدسی" لا تسبوا الدھر فان اللہ ھو الدھر" میں ھو الدھر خدا کی صفت ہے۔ جیسے "ھو اللہ احد" میں احد خدا کی صفت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی شان ہر گھڑی واقعات و حادثاتِ عالم کی صورت میں جلوہ نما ہے

(کل یوم ھو فی شان) یہ حدیث میری نظر سے تین طریق سے گزری ہے۔ تینوں کا مفہوم تقریباً ایک ہے[۱] اور تینوں کے راوی حضرت ابو ہریرہؓ ہیں۔ ان میں سے ایک حدیثِ قدسی جو اس مضمون کو بصراحت بیان کرتی ہے۔ اس طرح مروی ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا۔

قال اللہ تعالیٰ یوذینی ابن آدم یسب الدھر وانا الدھر بیدی الامر اقلب اللیل و النھار۔

(بخاری و مسلم عن ابی ہریرہؓ)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ابن آدم مجھے ایذا دیتا ہے کہ زمانے کو کوستا ہے۔ حالانکہ زمانہ تو میں ہوں۔ میرے ہاتھ میں تدابیرِ امر ہے۔ میں رات اور دن کو پلٹتا ہوں۔

مشکوٰۃ کتاب الاداب باب الاسامی میں اس طرح آئی ہیں۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تسموا العنب الکرم ولا تقولوا یا خیبۃ الدھر فان اللہ ھو الدھر (بخاری)

---

[۱] کہ دھر کو برا نہ کہو کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی دھر ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "انگور کو کرم" نہ کہو اور نہ یہ کہو کہ ہائے زمانہ کی کم بختی! کیونکہ اللہ ہی زمانہ ہے۔

لا یسب احدکم الدھر فان اللہ ھو الدھر (مسلم)

آنحضرتؐ نے فرمایا تم میں سے کوئی زمانے کو نہ کوسے کیونکہ اللہ ہی زمانہ ہے۔

ان احادیث کی روشنی میں امام شافعیؒ کا مقولہ الوقت سیف کا مفہوم سمجھ میں آتا ہے اور ساتھ ہی "الدھر" کو اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک نام قرار دینا بھی درست معلوم ہوتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مذکورہ آیاتِ قرآنی کی ان احادیث سے تطبیق کیسے کی جائے۔

علامہ کے نزدیک زمان کی اصلیت اختلافِ لیل و نہار پر مبنی نہیں ہے۔ قرآن مجید میں جس زمانہ کو عدد سنین و الحساب فرمایا گیا ہے۔ وہ اصل زمان نہیں، فرماتے ہیں۔

اصلِ وقت از گردشِ خورشید نیست
وقت جاوید است و خور جاوید نیست

وقت بذاتہٖ فانی یا عارضی چیز نہیں بلکہ وہ حقیقت ابدی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ زمان تخلیقی حرکت کا نام ہے اور خدا ہر وقت تخلیق میں مصروف ہے[1]۔ اس لئے زمان خدائی زندگی کا ایک جزو ہے یا اگر یہ لفظ مغالطہ آمیز نظر آئے تو یوں کہہ لیجئے کہ زمان حیاتِ ایزدی کی ایک شان ہے۔

قرآن مجید نے انقلابِ روز و شب کو اللہ کی سب سے بڑی نشانیوں میں سے قرار دیا ہے۔ اس لئے علامہ فرماتے ہیں ؎

گردشِ گردونِ گرداں دیدنی است
انقلاب روز و شب فہمیدنی است

یعنی گردشِ افلاک اور انقلاب روز و شب پر غور کرو۔ لیکن یہ نہ سمجھو کہ زمانہ بھی کوئی خارجی وجود رکھتا ہے ؎

ساختی ایں رشتہ را از تارِ دوش
گشتہ مثلِ تاں باطل فروش

---

[1] ؎ یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

اے مسلمان! اے وہ انسان جس کو خدا نے زمانہ پر حکمران بنایا تھا، تو نے اس تخیل کو گویا رشتۂ زنار بنالیا اور غلط خیالات کا شکار ہو گیا ؎

مسلمی ؟ آزادِ ایں زنّار باش
شمعِ بزمِ ملّتِ احرار باش

اے مخاطب کیا تو مسلمان ہے ؟ اگر ایسا ہے تو تیرا پہلا فرض یہ ہے کہ اس زنار کو گردن سے اُتار یعنی زمانہ کا وجود خارجی نہیں ہے بلکہ ذہنی ہے اور اس کی بدولت ہم حیات کا تصور کرتے ہیں۔ اگر ہمارے ذہن میں زمانہ کا تصور نہ ہو تو حیات کا تصور بھی نہیں ہو سکتا ؎

تو کہ از اصلِ زماں آگہ نہ
از حیاتِ جاوداں آگہ نہ

آگے چل کر فرماتے ہیں ؎

تا کجا در روز و شب باشی اسیر
رمزِ وقت از لی مع اللہ یاد گیر

یعنی تو کب تک سمجھتا رہے گا کہ زمانہ تجھ پر حکمران ہے ؟ تو کب تک اس غلط فہمی میں مبتلا رہے گا کہ تو زندانی لیل و نہار ہے۔ اگر تو جویائے حقیقتِ وقت ہے تو آنحضرت صلعم کی اس حدیث پر غور کر۔

لی مع اللہ وقت لا یسعنی فیہ نبی مرسل ولا ملک مقرب

یعنی بعض اوقات مجھے خدا کے ساتھ وہ راز و نیاز کا موقع حاصل ہوتا ہے کہ اس تخلیہ محفل میں نہ نبی مرسل بار پا سکتا ہے نہ ملک مقرب۔

مطلب یہ ہے کہ بعض اوقات مجھ پر ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے کہ اس کائنات میں مجھے اپنے اور خدا کے علاوہ کسی تیسری چیز کا احساس نہیں ہوتا۔ یعنی وقت روز و شب یا ماہ و سال کا نام نہیں بلکہ وہ ایک نفسیاتی کیفیت ہے۔ جس کا خارج میں وجود نہیں۔ صرف ذہن انسانی اس کا ادراک کرتا ہے کیونکہ وہ اسی کی پیداوار ہے۔

ایں و آں پیداست از رفتارِ وقت
زندگی سرّیست از اسرارِ وقت

کائنات میں جو حوادث رونما ہوتے ہیں یہ سب وقت کی رفتار کی بدولت ظہور میں آتے ہیں۔ واضح ہو کہ

وقت این و آں یعنی حوادثِ مظاہر اور واقعات سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ این و آں وقت سے پیدا ہوتے ہیں۔ لمحات (سیکنڈ منٹ ساعت) کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ ایک واحد لمحہ ہے۔ یہ جو آپ کے دماغ میں دوش امروز اور فردا کا تصور پیدا ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے اپنی سہولت کے لئے وقت کی وحدت کو حسب منشا حصّوں میں منقسم کر دیا ہے۔ دراصل زمانہ کوئی مادّی شے نہیں بلکہ ذہنی تصوّر ہے۔ فرماتے ہیں ؎

وقت را مثلِ مکاں گستردہ
امتیازِ دوش و فردا کردہ؟

علامہ کا خیال ہے جب انسان زندانِ وقت سے نکل جائے گا تو وہ زندہ جاوید ہو جائے گا اور اس کی ذات سے خرقِ عادت سرزد ہو سکیں گے۔ فیضیؔ مندرجہ ذیل اشعار میں ایسی ہی کیفیت بیان کرتا ہے ؎

من براہے میروم کانجا قدم نامحرم است — وز مقامے حرف مے گویم کہ دم نامحرم است
خوش دلم گر دیدۂ من شد سفید از انتظار — کز پے دیدار جاناں دیدہ ہم نامحرم است
ہر کجا جاں مے رود تن را در انجا بار نیست — ہر کجا سلطاں کند خلوت حشم نامحرم است
فیضیؔ از بزمِ نشاطِ ماحریفاں غافلند — ہر کجا ما جام مے گیریم جم نامحرم است

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ از روئے قرآن خارجی زمان جو انسان کے ذہن کی پیداوار ہے خدا نہیں ہے۔ خدا وہ مرورِ خالص ہے یا آنِ واحد ہے جس میں ماضی، حال اور مستقبل کی تقسیم نہیں ہے۔ انسان وقت کی اصلیت کے عرفان کی بدولت حقیقی زندگی کا مالک بن سکتا ہے۔ یعنی انسان زندہ ہی اس وقت ہوتا ہے جب کہ وہ زمان کا صحیح عرفان حاصل کرے ؎

زندگی از دہر و دہر از زندگی است
لاتسبوا الدھر فرمانِ نبی است

علامہ فرماتے ہیں کہ جو شخص اپنے آپ سے واقف نہیں وہ زمانہ کی حقیقت سے بھی واقف نہیں ہو سکتا۔ جب تم اپنے من میں ڈوب کر وقت کی حقیقت سے آگاہ ہو جاؤ گے تو تمہیں معلوم ہو گا کہ وہ قابلِ پیمائش نہیں اور نہ اس کا اوّل نہ آخر ہے اس لئے کہ وہ ایک ذہنی کیفیت ہے۔ اس لئے فرمایا ؎

وقتِ ما کو اوّل و آخر ندید
از خیابانِ ضمیرِ ما دمید

بشری تخلیق و ربانی تخلیق

قرآن کی رُو سے اللہ تعالیٰ احسن الخالقین ہے۔ اس کے برعکس انائے بشری نہ صرف خیر کی تخلیق کرتا ہے بلکہ شر کی تخلیق میں بھی نمایاں حصہ لیتا ہے اس درجہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ چنانچہ علامہ فرماتے ہیں جو انا اپنی تشکیل و تکمیل میں مصروف رہتا ہے وہ بتدریج ارتقار کی ایسی حالت میں پہنچ جاتا ہے کہ اسے اس احوال و ارتقار میں جو اس کی اپنی سرشت میں مضمر ہے اور اس مقصد میں جو اس کے خالق نے اس کے لئے مقصدِ حیات مقرر کیا ہے پوری مطابقت و موافقت نظر آتی ہے۔ اس کے برعکس جس انا نے اس مطابقت کے حاصل کرنے کے بجائے اپنی سرشت کو کچھ اس طرح مسخ کیا ہے کہ اس میں اور مقصدِ ربانی میں فصل و افتراق پیدا ہو گیا تو وہ تخلیق خیر کی استعداد کو کھو بیٹھتا ہے اور تخلیقِ شر میں مصروف ہو جاتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ بشری انا کی تخلیق استعداد انائے کبیر ہی کی ودیعت کردہ ہے لیکن اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے یہ بھی ماننا پڑے گا کہ بشری انا اپنی محدود اور مشروط تخلیقی استعداد کو عمل میں لا کر بہت سی قدریں پیدا کر سکتا ہے۔ اور کرتا ہے اور خارجی دُنیا میں تصرف کر کے اپنے تجربات سے ان چیزوں کو معرضِ وجود میں لاتا ہے جو اس کے بغیر معدوم رہتیں۔

خدا کے احسن الخالقین ہونے کی صفت سے کم از کم یہ تو ظاہر ہے کہ اگرچہ خالقِ مطلق وہی ہے لیکن ایک قسم کی اضافی استعداد تخلیق اس نے دوسری اناؤں کو بھی عطا کی ہے۔ اقبال کہتا ہے کہ یہ استعداد تخلیق صرف اس حالت میں واقعیت کی شکل اختیار کرتی ہے جبکہ بشری انا نے اپنے آپ کو عشق سے مربوط اور مضبوط کر کے اپنی شخصیت کا تناؤ زیادہ سے زیادہ کر لیا ہو۔ اس کام کے لئے صلوٰۃ بہترین ذریعہ ہے۔ اسلام نفسیاتِ انسانی کی ایک اہم حقیقت کو تسلیم کرتا ہے اور وہ ہے خود مختارانہ فعل کے صادر کرنے کی طاقت کا مدوجزر۔ اسلام چاہتا ہے کہ انا کی یہ طاقت بغیر کسی قسم کی تخفیف کے برقرار رہے۔ قرآنِ کریم کے مطابق صلوٰۃ بشری انا کو حیات اور اختیار کے سرچشمہ سے قریب تر لے آتی ہے۔ اوقاتِ صلوٰۃ کے تعین سے مقصود یہ ہے کہ انا کو روزمرہ کے کاروبار میں میکانکی اثرات سے بچایا جائے اس طرح اسلام نے صلوٰۃ کو انا کے لئے میکانیت سے اختیار کی طرف بچ نکلنے کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ اقبال کہتا ہے کہ جب انا صلوٰۃ اور عشق کے روح پرور اثرات سے مضبوط تر ہو جاتا ہے تو اس کی تخلیقی استعداد خوب پھلتی پھولتی ہے۔